(غلام گردش)

فادرز ڈے

سمجھ نہیں آتا کہ فادرز ڈے کیا ہے۔ بلکہ کیوں ہے۔کل جوگرز گیا، بتایا گیا کہ اپنے والد کو یاد کرنے کا دن تھا۔عجب فسوں سا ہوا۔ دکھ کی لکیر شانوں سے نکلی اور روح کی گہرائی میں جذب ہوگئی۔ بھلا والد بلکہ ماں باپ کو ذہن میں نمایاں رکھنے کا بھی کوئی دن مختص ہوسکتا ہے۔عرض کروں گا کہ کیا قریبی عزیزوں، رشتہ داروں کو بھی بھلایا جاسکتا ہے۔تمام رشتے جو ہم سے بچھڑ گئے، کیا سال میں صرف ایک دن کے محتاج ہیں۔نہیں صاحب، قطعاً نہیں۔ یہ تو قیمتی لوگ ہیں جو یادیں بنکر بارہ ماہ کے ایک ایک پل آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔افسوس یہ بھی ہے، کہ اکثر افراد بیش قیمت رشتوں کی زندگی میں قدر نہیں کرتے۔اسکے بعد صرف اور صرف دکھ ہے۔شدید پچھتاوا، جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید طاقتور ہو جاتا ہے۔

خوش قسمت ہوں کہ بھرپور اور انتہائی توازن والے ماں باپ ملے۔دونوں میں انتہا کا فرق مگر زندگی میں خلوص اور محبت بانٹتے رہے۔اپنوں میں بھی اور غیروں میں بھی۔سرکار کی نوکری کرتے ہوئے تین دہائیاں صَرف ہوگئیں۔کوئی دن نہیں جاتا، جب اجنبی سے اشخاص بھی جج صاحب اور پرنسپل صاحبہ کا عزت سے ذکر نہیں کرتے۔کوئی ایسا لمحہ نہیں جب ایک سیکنڈ کیلئے بھی ان دونوں کی یاد سے ذہن خالی ہوا ہو۔نہ ہنگام اور نہ ہی تنہائی میں۔خیر اب تو تنہائی کا اسیر ہوں۔خود ساختہ مگر دل صرف اور صرف گوشہِ تنہائی ہی میں لگتا ہے۔ماں باپ کسے پیارے نہیں ہوتے۔خدا ہر ایک کے سر پر انکا سایہ سلامت رکھے۔مگر دشتِ ہستی میں اس سائے سے محروم ہونا لازم ہے۔قطعی ہے۔یہ قیامت ہر ایک پر وار کرتی ہے۔اگر یہ ترتیب اُلٹ ہو جائے تو صاحبان، والدین جیتے جی مر جاتے ہیں۔زندگی میں سب سے بوجھل چیز اپنی پیاری اولاد کو کندھا دینا ہے۔ پر یہ دکھ بھی گاہے بگاہے دیکھنے کو ملتا ہے۔پچھلے مہینے کراچی گیا۔اپنے بیچ میٹ، شہاب بھلی سے تعزیت کیلئے جانا تھا۔شہاب کا نوجوان اور قیمتی بیٹا کراچی میں ایک سانحہ کا شکار ہوگیا۔سوچتا رہا، کہ جاؤں یا نہ جاؤں، کیا بیٹے کے جدا ہونے کے اَلم کو دیکھنا ضروری ہے۔دل کڑا کر کے شہاب کے گھر گیا۔کئی منٹ خاموش بیٹھا رہا۔افسوس کے کیا الفاظ بولوں۔کیا واقعی، لفظ اس رنج کا مداوا کر سکتے ہیں۔جو باپ پر جوان بیٹے کے جدا ہونے پر گزر گیا۔نہیں، شائد کبھی نہیں۔شہاب انتہائی استقلال سے پرسا لیتا رہا۔آنکھوں میں پانی کو چھپا کر باتیں کرتا رہا۔جب دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے، تو اپنی آنکھیں نم ہونے کا احساس ہوا۔شہاب حوصلے میں تھا۔خدا اسے اس صدمے سے نکلنے کی ہمت دے۔یقین فرمایئے، کئی بار، ان مقامات پر جا ہی نہیں سکتا۔جہاں دکھ، تکلیف کی منزلیں شروع ہوتی ہیں۔اپنے بچوں کے اچانک دنیا سے جانے کا وہ اَلم ہے، جس نے دنیا کے افضل ترین انسان محمد ﷺ عربی کو نہیں بخشا۔ہم کیا چیز ہیں۔اپنی ایک اور بیچ میٹ انجم اسد امین کی جواں سالہ بچی کے دنیا سے جانے پر ہمت نہ کر پایا کہ جا کر افسوس کر سکوں۔خدا، انجم کو مزید حوصلہ اور قوت دے۔اس پر جو قیامت گزری، اسکا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔سوال پھر سامنے آ گیا۔کیا والدین، عزیز و اقارب اور دوستوں کو یاد کرنے کیلئے صرف ایک دن مختص ہونا چاہیے۔ پتہ نہیں کیوں، اس مغربی سماجی رسم سے الجھن سی ہوتی ہے۔

ماں جی، علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے پاکستان آئیں تو انکے پاس صرف ایک تعلیمی ڈگری ہی تھی۔ 1950 میں علی گڑھ میں کتنی مسلمان خواتین سائنس پڑھتی ہونگی۔ آٹے میں نمک کے برابر۔ انہوں نے بوٹنی (Botany) میں ایم ایس سی کی۔ پاکستان آنے کے بعد پوری عمر تدریس میں صَرف کر دی۔ لائل پور میں لڑکیوں کا ایک بہت بڑا کالج ہے۔ کارخانے بازار سے متصل۔ وہاں سترہ اٹھارہ سال پڑھاتی رہیں۔ اب تو وہ کالج خیر بہت پھل پھول چکا ہے۔ امی کی وفات کے بعد میں جب کبھی لائل پور جاتا ہوں تو کالج کے سامنے سے ہرگز نہیں گزرتا۔ پتہ نہیں کیوں، میرے لیے وہ درسگاہ حد درجہ مقدس ہے۔ شائد اسلیے کہ وہاں میری والدہ بچیوں کو تعلیم دیتی رہیں اور تہذیب سکھاتی رہیں۔ والدہ تعلیم کے متعلق بہت سخت گیر تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں پر بہت محنت کی اور کامیاب بھی رہیں۔ میں کیڈٹ کالج حسن ابدال چلا گیا اور وہاں سے کے ای میں آ گیا۔ چھوٹی بہن بھی ڈاکٹر بن گئی۔ سب سے چھوٹا بھائی مبشر انجینئر بن گیا۔ جتنی محنت امی جی نے بچوں کی تربیت پر کی، اتنی ریاضت اب دیکھنے میں نہیں ملتی۔ تعلیمی اعتبار سے انتہائی فعال زندگی گزارنے کے بعد ماں جی نے ایک بچوں کا سکول کھول لیا۔ لائل پور میں گھر کے نزدیک۔ گھر سے یاد آیا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں انتہائی محبت اور محنت سے ایک گھر بنایا۔ انتہائی کشادہ اور خوبصورت۔ آج بھی اس گھر میں جاتا ہوں تو ہر کونے میں اپنی ماں کی کمی محسوس کرتا ہوں۔ ایک عجیب سی اداسی گھیرے میں لے لیتی ہے۔ جس دن فون آیا کہ امی کو فالج ہوا ہے۔ دوڑتا ہوا فیصل آباد پہنچا۔ انکو لاہور لانے کا فیصلہ صرف میرا تھا۔ ڈاکٹروں نے منع کیا کہ اسی وقت منتقل کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ پر مجھے اندازہ تھا کہ لاہور میں صحت کے حوالے سے قدرے بہتر ہسپتال ہیں۔ پہلی بار احساس ہوا، کہ اگر ایک صحت مند، زندگی سے بھرپور انسان فالج جیسی بھیانک بیماری کا شکار ہو جائے، تو کیا ہوتا ہے۔ دکھ کی شدت اسی وقت معلوم پڑتی ہے، جب دکھ انسان کی اپنی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ایمبولینس میں لاہور آنے کے وہ تین گھنٹے میرے لیے بہت کٹھن تھے۔ خیر لاہور میں آئی سی یو کے مزید چند دن بہت اذیت سے گزرے۔ والدہ بے ہوش تھیں۔ چند دن بعد ہوش آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ انکے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ میری بہنوں، بھائیوں اور اہل خانہ کیلئے بھی۔ اس کے بعد آخری لمحے تک میرے پاس رہیں۔ گھر کے ایک کمرے کو ہسپتال بنا دیا۔ جو میرے اختیار میں تھا۔ کر گزرا۔ پر صاحب، اصل میں انسان کے اختیار میں بہت ہی کم چیزیں ہیں۔ لاہور سے جب ڈی سی او، نارووال اور پھر گجرانوالہ جانا پڑا تو ماں جی میرے ساتھ تھیں۔ واپس لاہور آیا، تو میرے ہمراہ تھیں۔ بہاولپور ہاؤس کے سرکاری گھر میں میرے ساتھ ہی قیام کیا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی اسکول سے گھر آئیں تو سب سے پہلے دادی کے کمرے میں جا کر انکے پیر دبائیں۔ ان سے باتیں کریں۔ میری اہلیہ اور بہنوں نے میری والدہ کی اَز حد خدمت کی۔ پوری زندگی ان لوگوں کا احسان نہیں اُتار سکتا۔ امی جی کے جانے کے بعد اسی کمرے کو اپنی سٹڈی میں تبدیل کر دیا۔ عجیب سکون سا ملتا ہے اس جگہ پر۔ لکھنے جیسا کٹھن کام، آسان سا ہو جاتا ہے۔

جج صاحب دوستوں کے دوست اور محفلی انسان تھے۔ یہ محفل انکے تین چار دوستوں سے شروع ہوتی تھی اور انہی پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ مرتے دم تک وہی لوگ انکے ساتھ رہے۔ مشتاق دھامنا صاحب، فیصل آباد کی بھرپور شناخت تھے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ انکے صاحبزادے سکندر مشتاق کو دیکھتا ہوں تو پورا دور ذہن میں آ جاتا ہے۔ کیسے کیسے بھرپور لوگ، رزق خاک ہوئے۔ حاجی

رشید صاحب، اور منور صاحب ہر دم جج صاحب کے ساتھ ہوتے تھے۔ جج صاحب پورا ہفتہ اکیلے گزارتے تھے۔ یاد ہے، سیشن ہاؤس میں مہینوں کوئی نہیں آتا تھا۔ ہر جج کے اندر ایک روایتی سختی ہوتی ہے۔ اس سختی کی عزت کرنی چاہیے۔ شیخ وحید صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ شیخ صاحب، جج صاحب کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ہائیکورٹ کے جج بن کر ریٹائر ہوئے۔ شیخ وحید کو بھی رخصت ہوئے زمانہ گزر گیا۔ جج صاحب، جب وکالت کرتے تھے تو کافی امیر تھے۔ 1960 میں انکے پاس ذاتی گاڑی تھی۔ چابی سے چلنے والی نہیں، بلکہ اس زمانے میں ڈرائیور گاڑی کے انجن کو ایک ہینڈل سے سٹارٹ کرتا تھا۔ سفید رنگ کی بڑی سی گاڑی تھی۔ شائد شیورلٹ تھی۔ لائل پور میں اس وقت بیس پچیس گاڑیاں ہونگی۔ جج بننے کے بعد والد صاحب، ایک دم سفید پوش سے ہو گئے۔ والد اور والدہ کی تنخواہ سے گزارا چلتا تھا۔ مجھے تو خیر قطعاً کچھ اندازہ نہیں تھا۔ مگر گھر میں کھانا ضرورت سے زیادہ سادہ ہو گیا۔ مگر تعلیم پر کوئی سمجھوتا نہ کیا گیا۔ سارے بہن بھائی بہترین اسکولوں اور کالجوں میں گئے۔ جہلم، جھنگ، قصور اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے سیشن ہاؤس، رقبہ میں بہت بڑے، مگر رہنے کے اعتبار سے انتہائی سادہ سے تھے۔ شائد اس وقت کے لوگوں میں تصنع کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جج صاحب، اپنی نوکری میں گاڑی نہیں تبدیل کر سکے۔ جب وہ قصور میں تعینات تھے، تو کئی بار لاہور سے قصور بس پر چلے جاتے تھے۔ بس میں آنے جانے پر کوئی بھی ہتک محسوس نہیں کرتے تھے۔ خیر میں تیس چالیس سال پرانی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت کے معیار اور آج کے مصنوعی معیاروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شائد آپکو یقین نہ آئے، میں نے ہائیکورٹ کے ججوں کو سائیکل پر عدالت جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ سیشن جج اور سول ججوں میں بہت کم کے پاس ذاتی گاڑیاں تھیں۔ سرکاری گاڑیاں تو خیر تھی ہی نہیں جب میں اسسٹنٹ کمشنر تھا، تو میرے والد کے پاس تیس سال پرانی ذاتی گاڑی تھی۔ 1987 تک سرکاری گاڑی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ سیشن جج کو سرکاری گاڑیاں 1988 میں ملی ہیں یا شائد 89 میں۔

لکھتے ہوئے ایک اور نام ذہن میں بار بار آ رہا ہے۔ رائے احمد نواز۔ میرے ہم زلف رائے حسن نواز کے بڑے بھائی تھے۔ احمد نواز بہت جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جتنی بے تکلفی سے رائے صاحب اور میاں نواز شریف آپس میں ہنسی مذاق کرتے تھے، تصور کرنا مشکل ہے۔ بھائی احمد نواز کو شائد جانے کی بہت جلدی تھی۔ ایک ایسا شخص جو مشکل سے مشکل کام بھی چٹکیوں میں کر ڈالتا تھا۔ سادہ سا مخلص انسان۔ دن میں کئی بار ذہن انکی طرف ضرور جاتا ہے۔ خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اختتام پر یہ عرض کرونگا کہ والدین، دوستوں اور قریبی رشتہ داروں کی یاد کیلئے سال میں صرف ایک دن، رشتوں کی ناقدری ہے۔ یہ ہماری سماجی روایات سے بھی متضاد ہے۔ صرف فادرز ڈے یا مدرز ڈے پر بزرگوں کو یاد رکھنے کے سلسلے کو گناہ سمجھتا ہوں۔ یہ رشتے تو ہمارے اردگرد موتیوں کی طرح پورے سال بکھرے رہتے ہیں۔ دن کے ہر لمحہ میں، سال کے ہر مہینہ میں۔ جو خیال ہر دم موجود ہوں، بھلا اسے کیسے یاد رکھا جائے۔ وہ بھی محض ایک دن کیلئے۔ انہیں یادوں کی بدولت میرے جیسے عاجز طالبعلم سانس لیتے ہیں۔ بھلا سانس لینے سے انسان کیسے غافل ہو سکتا ہے!

راؤ منظر حیات